دارالعلوم دیوبند کے مردِ ذکی و دوٗر اندیش
حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

بہ قلم: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر ''الداعی'' عربی واستاذ ادبِ عربی
دارالعلوم دیوبند

یاد سے تیری، دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

شنبہ: ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ=۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو یہ راقم اپنے معالجین کے مشورے کے مطابق، اپنی رہایش گاہ افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد کے صحن میں نماز فجر کے بعد چہل قدمی کررہا تھا کہ دارالعلوم کی مسجدِ قدیم کے میناروں سے بلند ہونے والے اِس اِعلان نے انتہائی حزن وملال کے ساتھ بے پایاں حیرت میں ڈال دیا کہ دارالعلوم کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا ابھی ذرا دیر پہلے انتقال ہوگیا ہے، إنَّا للّٰہِ وإنَّا إلَیْہِ رٰجِعُونَ. راقم کے تجسس کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ ۳-۴ بجے قبیلِ اذانِ فجر، اُن کو سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوئی تو اُنھوں نے فرزندِ اکبر مولانا سفیان سلّمہٗ کو فون کیا، وہ کسی قریب کے ڈاکٹر کو بلانے گئے کہ اتنے میں اُن کی روح پرواز کرگئی۔ وقت کوئی ۷ بجے صبح کا تھا۔

مرحوم کی وفات کے اعلان پر حیرت اِس لیے ہوئی کہ اُن کے متعلق معلوم تھا کہ وہ حالیہ دنوں میں کسی تشویش ناک عارضے میں مبتلا نہ تھے؛ بل کہ معمول کی زندگی گزار رہے تھے، ہر چند کہ وہ عرصۂ دراز سے شکر کے موذی مرض کا شکار تھے، اس کی وجہ سے انھیں دل اور گردے وغیرہ کی تکلیف رہتی تھی، وہ چند ماہ قبل بھی اِسی سلسلے میں دیوبند کے مشہور ڈاکٹر ''ڈی، کے، جین'' کے ہسپتال میں بہ غرضِ علاج کئی روز داخل رہے، اس وقت قدرے تشویش کی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی؛ لیکن الحمدللہ وہ اس سے صحت یاب ہوکر اپنے گھر آگئے۔ یہ راقم ہسپتال تو اُن کی عیادت کو اپنی کم زوری اور امراض کی وجہ

سے نہ جاسکا؛ لیکن ہسپتال سے اُن کی گھر واپسی کے ایک آدھ روز کے بعد اُن کے دولت کدے پر اُن کی عیادت کو پہنچا تو جسمانی کم زوری — جس کا اثر اُن کی آواز پر بھی تھا — کے باوجود وہ چست تھے، مزاج پرسی پر ایسے الفاظ کہے جیسے اُن کو کوئی بڑی تکلیف نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ اُن کی افتادِ تھی کہ وہ کسی مسئلے کو زیادہ اوڑھتے نہ تھے، صبر وتحمل اور توکل سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے مسئلے سے گھبراتے نہ پریشان ہوتے، اعصاب پر ایسا قابو رکھنے والا اور مشکل اوقات میں بھی متبسّم رہنے والا راقم نے اُن کے ایسے کم لوگوں کو پایا ہے۔

حزن وملال کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ دارالعلوم کے مدرسین کے خاندان کے بہت سی وجوہات کی وجہ سے ممتاز فرد تھے، اُن کی وفات کی خبر سے ایسا لگا کہ کوئی لاثانی گوہر کھو گیا ہے، وہ دارالعلوم کے نمایاں معاصر فضلا میں تھے، دورۂ حدیث میں اپنے سارے رفقاے درس سے فائق رہے، وہ علمی پختگی اور ٹھوس لیاقت کے ساتھ ساتھ ذہانت واِصابتِ راے، معاملہ فہمی، دور بینی، ظرافتِ طبعی، حاضر جوابی، شریں کلامی، سُخن وری، طلاقتِ لسانی، سلاستِ قلمی، تقریری شستگی اور خوش خطی میں طاق تھے۔ اکثر طلبہ ومدرسین وملازمین اُن سے اپنے مسائل میں مشورہ کرنے اور رائے لینے اُن کے پاس جاتے، وہ ہر ایک کو اُس کے متعلقہ مسئلے میں ایسا مشورہ دیتے، جس سے وہ مسئلہ بہ حسن وخوبی ضرور حل ہوجاتا تھا۔ دارالعلوم کے اعلیٰ ذمے داروں؛ بالخصوص سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن قُدِّسَ سِرُّہٗ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء =۱۴۳۲ھ/۲۰۱۰ء) کے تو وہ دارالعلوم کے پیش آمدہ پیچیدہ معاملات میں خصوصی مشیر ومعتمد تھے۔ حق یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم کو جو حالات ومعاملات مسلسل پیش آئے، اُن میں سے بہت سے معاملے اُنھی کے مشورے سے حل ہوئے یا اُن کے حل ہونے کی راہ ہم وار ہوئی۔ وہ جس دَور میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، وہ اور اس سے قبل کے ادوار ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم کا تخلیقی دورِ بَہار تھے، اس زمانے کا ہر فاضل ہمہ جہت علمی صلاحیت، انتظامی لیاقت اور مردم گری کی غیر معمولی اہلیت کا حامل نظر آتا ہے اور مولانا ریاست علی جیسے نام ور فضلا کا تو پوچھنا ہی کیا۔

شنبہ: ۲۳؍شعبان = ۲۰؍مئی ہی کو نمازِ عصر کے بعد اُن کی نماز جنازہ، دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں، دارالعلوم کے استاذِ حدیث اور جمعیۃ علماے ہند (م) کے صدر حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری مدظلہٗ نے پڑھائی۔ دارالعلوم اور دیگر سارے مدرسوں میں رمضان کی تعطیلِ کلاں کا زمانہ تھا جو عموماً ۱۵؍شعبان یا اس سے پہلے سے شروع ہوجاتا ہے، اس کے باوجود دیوبند کے عمائدین وعوام کے علاوہ علما وطلبہ کے جمِّ غفیر نے مرحوم کے جنازے اور تدفین میں شرکت کی۔

افسوس ہے کہ دل کی بائی پاس سرجری کی وجہ سے، جس پر چند ہی روز گزرے تھے اور ڈاکٹروں نے زینہ چڑھنے اترنے نیز نشیب وفراز عبور کرنے سے منع کر رکھا تھا، یہ راقم مرحوم کی، دیوبند میں رہتے ہوئے، آخری دید کرسکا نہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت حاصل کرسکا، جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ فون ہی سے مرحوم کے فرزند خرد مولانا سعدان سلّمہٗ سے تعزیتی کلمات کہے تو آواز اتنی ریندھ گئی کہ وہ الفاظ صحیح طور پر ادا نہ ہوسکے اور بہ مشکل غیر مربوط طور پر ادا کردیے گئے۔

کئی روز تک ایسا رہا کہ جو اساتذہ وطلبہ راقم کی عیادت کو آتے رہے، اُن سے زیادہ تر مولانا مرحوم ہی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اُن کی یاد کے ساتھ ہی اکثر آواز گلوگیر ہوجاتی اور جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا، اندازہ نہ تھا کہ مرحوم سے راقم کو ایسا دلی تعلق ہے؛ لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی شے یا شخص کی قدر اس کے فوت ہوجانے کے بعد ہی کرتا ہے۔ مرحوم کی وفات سے دارالعلوم میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا بہ ظاہر احوال مشکل معلوم ہوتا ہے، گو خدائے قادر ووہّاب ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔ اِعجاز اِلٰہی ہے کہ وہ اہلِ کمال کو بھی کمالات کے الگ الگ گوشوں کا حامل بناتا ہے؛ اِس لیے کسی بھی اہلِ کمال کے اُٹھ جانے کے بعد ایسا خلا ہوجاتا ہے جو دیگر سارے زندہ اہلِ کمال مل کر بھی پورا نہیں کرپاتے؛ کیوں کہ فوت شدہ باکمال ایسا ہیرا ہوتا ہے جو تنہا حالات کے بہت سے ناگزیر تقاضوں کے نگینے میں صحیح طور پر فٹ ہوتا ہے؛ اس لیے مسائل کی زلفِ گرہ گیر کو سنوارنے کی جب جب ضرورت پڑتی ہے اور حالات وواقعات کا جب جب اپنا خاص تقاضا ہوتا ہے، وہی اہلِ کمال یاد آتا ہے اور یہ یاد بہت کچوکے لگاتی ہے کہ کیوں نہ ہم نے اسے کسی جتن کے ذریعے فوت ہونے سے بچائے رکھا؟

مولانا مرحوم جہاں تک میرے علم میں ہے دارالعلوم کے اساتذۂ گرامی کے درمیان تنہا مجلسی روایت کے امین رہ گئے تھے، عصر کی نماز کے بعد اُن کے پاس دسیوں اساتذہ وطلبہ اور بعض دفعہ بعض اہلِ شہر آجاتے، مرحوم ہر ایک کی چائے سے تواضع فرماتے، کوئی بھی کسی موضوع کو چھیڑ دیتا خواہ دینی ہو یا دنیوی، علمی ہو یا ادبی، عام حالاتِ حاضرہ سے اس کا تعلق ہو یا خاص دارالعلوم کے کسی تازہ معاملے سے؛ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینی، شگفتہ گوئی اور بذلہ سنجی مجلس کو زعفران زار بنادیتی، جس سے لوگ تادیر؛ بل کہ بعض دفعہ کئی دنوں تک اور ہفتوں ومہینوں تک محظوظ ہوتے رہتے۔ یہ رنگ اُن کی خاص مجلس ہی کا نہ تھا؛ بل کہ کوئی مجلس ہو اگر مولانا ریاست علی بجنوری اس میں موجود ہوتے تو مجلس کی خشکی اُن کے پرکیف ظریفانہ جملوں سے ضرور کافور ہوتی رہتی؛ حتی کہ دارالعلوم میں جو

میٹنگیں دارالعلوم کے ذمے دارِاعلیٰ کی طرف سے بلائی جاتیں وہ بھی مولاناؒ کی نشاط انگیز اور روح افزا معنی آفرینیوں سے بہرہ یاب ہونے سے کبھی محروم نہ رہتیں، لوگ مجلس سے نکلتے تو اُنھیں اُن نکتوں سے اس طرح لطف لیتے ہوئے پایا جاتا، جیسے لوگ کسی تازہ دم کردینے والے بے مثال نشاط انگیز مشروب کو لینے کے بعد، تادیر مزے لیتے رہتے ہیں۔ اُن کا ایک ظریفانہ جملہ تو مثل اور کہاوت کی طرح زبان زدِ خاص وعام ہے جو اُنھوں نے دارالعلوم کے ایک استاذ کو جو اُن کے ہم سبق ہیں، اُس وقت کہا تھا، جب اُنھوں نے ایک مجلس میں اُن سے یہ کہا کہ تم دارالعلوم میں میرے بعد مدرس ہوئے تھے؛ اس لیے تم جونئر ہو اور میں تم سے سینئر ہوں، مولاناؒ نے برجستہ اُن سے فرمایا: ''دارالعلوم نے کسی نامعلوم حکمت کے تحت مجھے اُس وقت تک تدریسی خدمت کے لیے نہیں چنا؛ جب تک میری صلاحیت گھٹتے گھٹتے تمھارے برابر نہیں ہوگئی''۔ اس جملے کی چستی اور برجستگی پر لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ مولاناؒ کے جملے اور تعبیرات کا انداز ''بیانیہ'' نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ عموماً اُن میں تہہ داری اور معنویت ہوتی تھی۔

مولانا کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ معاشرتی زندگی جینے کے فن میں بڑے ماہر تھے۔ کوئی آدمی اُن سے کوئی معاملہ کرکے کبھی بے مزہ نہ ہوتا تھا؛ کیوں کہ وہ کسی بات پر خواہ وہ کتنا ہی غصہ دلانے والی ہو زبان سے یا چہرے مہرے کی کسی ادا سے خفگی کا اظہار کرتے نہ برا ماننے کی کیفیت نمایاں ہونے دیتے، وہ اشتعال انگیز صورتِ حال میں بھی شگفتہ رو اور خندہ جبیں رہتے۔ آج بعد از مرگ بھی، اُن کی شبیہ جب بھی میرے خانۂ خیال میں آتی ہے تو وہ شاداب نظر آتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا رہا ہوگا کہ وہ اُن سے ناخوش ہیں؛ کیوں کہ اُن کی خندہ روئی اور معنویّت وظرافت سے پُر اُن کے جملے مخاطب کو اُن کے متعلق کسی منفی سوچ پر کبھی آمادہ نہ ہونے دیتے تھے؛ اِسی لیے اُن کے دشمنوں کی تعداد شاید وباید اور دوستوں کی تعداد بے شمار تھی۔ اُنھوں نے لوگوں کو اپنی ادائے زندگی سے خوشی ہی دی، رنج وغم سے اُنھیں ہمیشہ دور رکھا۔ اُن سے ملنے والوں کو سکون واطمینان کا سرمایہ ملا، انتشار وتشویش کی کسی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہ ہوا۔ اِس طرح کا آدمی پسِ مرگ اپنے بعد کے لوگوں کو بہت یاد آتا ہے جو اُن کا صرف ذکرِ خیر کرتے اور بے پناہ دعاؤں سے نوازتے ہیں؛ اِسی لیے اُن کی وفات کے بعد جتنے لوگوں سے راقم کی ملاقات ہوئی سب ہی بہت رنجیدہ اور متاثر نظر آئے، ہر ایک کو اُن کی خوش اخلاقی وحسنِ معاملہ ودل جوئی بار بار یاد آتی اور دیدۂ ودل کو متاثر کرجاتی ہے۔

درس گاہ میں بھی وہ شگفتہ خاطر رہتے۔ اُن کے درس میں اِسی لیے طلبہ کا بہت جی لگتا تھا، وہ

درسی مسائل کو اپنی مرتب ومربوط اور سلیس وشستہ زبان میں اس طرح بیان کرتے کہ وہ دورانِ درس ہی طلبہ کے ذہنوں میں اتر جاتے۔ اس سلسلے میں دو باتیں اُنھیں بہت کام دیتی تھیں: ایک تو یہ کہ اُنھیں اُن مضامین پر مکمل عبور تھا جنھیں وہ پڑھاتے تھے؛ کیوں کہ طبعی ذہانت اور اپنی محنت سے اُنھوں نے اپنی طالب علمی ہی میں تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کرلیا تھا، اسی کے ساتھ وہ سابقہ تیاری اور مطالعہ کے بغیر کبھی درس گاہ میں نہ آتے تھے، نیز عرصۂ دراز سے درس وتدریس کے مشغلے نے اُن کی تدریسی صلاحیت کو چار چاند لگادیے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اُن کی فصاحتِ لسانی اور شگفتہ بیانی ہمہ وقت اُن کا ساتھ دیتی تھی۔ وہ سال ہا سال سے شکر کی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا تھے، دبلے پتلے اور منحنی جسم کے تو وہ تھے ہی؛ لیکن درس گاہ اور مجلس میں وہ کبھی ناحاضر دماغ نظر نہیں آئے؛ بل کہ ہمیشہ وہ فی البدیہہ گو اور حاضر جواب وبرجستہ بیاں رہے، تاحیات اُن کی یہ خوبی قائم رہی اور بیماری یا بڑھاپے سے متاثر نہیں ہوئی۔ اُن کی نکتہ سنجی ومعنی آفرینی اِس پر مستزاد ہوتی۔ اُن کے درس کے مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ دیگر تدریسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبردست ترسیلی وتفہیمی قوت کے مالک تھے، تدریس اور تقریر ہی نہیں عام مجلسی گفتگو کے لیے بھی یہ قوت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بہت سے لوگ علم وفضل سے بہرہ ور تو ہوتے ہیں؛ لیکن ترسیلی ملکہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں؛ اِس لیے وہ نہ صرف اِفادیت کے لائق نہیں ہوتے؛ بل کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اپنی باتوں کی تفہیم سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کرکے تفہیمی صلاحیت کے حامل لوگوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔

مولاناؒ اپنی اِن خوبیوں کی وجہ سے انتہائی بارآور مدرس کی طرح، زبردست مقرر بھی تھے، اُن کی تقریریں دلچسپ اور کیف آور ہوتی تھیں، اُنھیں اپنی بات کو سمیٹ کر الفاظ کے خوب صورت سانچے میں ڈھالنے میں مہارت تھی۔ وہ لفظ ومعنی میں توازن وہم آہنگی کا خاص خیال رکھتے تھے اور دونوں کی قدر وقیمت اور جائے استعمال کی اہمیت سے خوب واقف تھے، اِس لیے اپنے مطلب کو ادا کرنے کے ہنر میں بھی فرد تھے۔ ہم ایسے لوگوں کو اُن سے بات کرکے اِتنا مزا آتا تھا کہ اسے بیان کرنے کے لیے راقم کے پاس موزوں الفاظ نہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں اُن کے ایسے چند ہی لوگ دیکھے ہیں، جو اِس صفت میں اُن کے شریک تھے، اُن کی جدائی سے شدید رنج ہوا اور ایسے ہی مولاناؒ کی وفات سے؛ کیوں کہ سُخن وری اور الفاظ وتعبیرات کی نزاکت کی معرفت کی صفت جن لوگوں میں ہوتی ہے، وہ اپنے ایسے دیگر لوگوں کی بھی بے حد قدر کرتے ہیں اور اُن سے مخاطب ہوکر جی اِتنا خوش ہوتا ہے کہ تادیر وہ خوشی قائم رہتی ہے۔ اُن کے برعکس لوگوں سے بات کرکے بہت افسوس ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ

لوگ گھوڑے اور گدھے کے فرق کو ذرا بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کے سراسر ظالمانہ وصلیبی وصہیونی حملے کے دوران راقم نے عربی کے علاوہ اردو میں بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں صلیبیت وصہیونیت کے مکروفریب سے دلائل کی روشنی میں پردہ اٹھایا گیا تھا، اخبارات میں مولاناؒ کی نظر اُن میں سے بعض پر پڑی تو اُنھوں نے فون پر بعض تعبیرات کی پسندیدگی کا بہ طورِ خاص راقم سے تذکرہ کیا اور اُن کی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اُنھیں سراہا اور یہ فرما کر حوصلہ افزائی کی کہ اِن میں جدت طرازی کے ساتھ برجستگی بھی ہے۔ اُن کے سوا کسی اور عالم یا رفیقِ تدریس نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کہی؛ کیوں کہ ہمارے حلقے میں بالعموم زبان کی لذت سے ناآشنائی بھی ہے اور درسیات کے سوا کسی اور کام کی چیز کو پڑھنے سے شدید ''پرہیز'' بھی۔

مولانا کی تحریری نثر میں بلا کی چاشنی اور ایجاز وجامعیت ونفاست ہوتی تھی؛ اِسی لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم کی اکثر اہم تحریریں اُنھی سے لکھوائی گئیں۔ بعض دفعہ شوریٰ کی کارروائیوں کے مسودے بھی اُنھی نے ترتیب دیے، مختلف جلسوں کے لیے مہتمم صاحبؒ کی طرف سے خطبۂ صدارت یا خطبۂ استقبالیہ لکھنے کی ذمہ داری اُنھی کے سپرد کی گئی۔

اُن کی نثر کی حلاوت وسلاست کا ایک مختصر سا نمونہ نذرِ قارئین ہے۔ وہ مولانا کاشف الہاشمیؒ کی خصائل نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''...ان ادبی کمالات کے علاوہ، وہ اخلاقِ حسنہ کا پیکرِ جمیل تھے، جس نے اُن کی ذات کو دل آویز شخصیت بنا دیا تھا، گویا وہ فطرت کا تراشیدہ ایسا ہیرا تھے جس کا ہر پہلو حسن وجمال اور رنگ ونور کا جاذبِ نظر منظر پیش کرتا تھا۔ اُن کی ذات میں علم کے ساتھ عمل، حسب ونسب کی بلندی کے ساتھ تواضع، نظافت کے ساتھ سلیقہ، اِصابتِ رائے کے ساتھ خود اعتمادی، فقر کے ساتھ توکل، غنائے نفس اور سیر چشمی، سخاوت، شجاعت اور شمع کی طرح اپنا نقصان کر کے دوسروں کے لیے ماحول کو منور کرنے جیسے اوصاف تھے۔'' (کلیات کاشف، ص ۲۸-۲۹)

اُن کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تمھیں شعر وسخن کا ذوق ہے، چلو تمھیں ایک باکمال شاعر سے ملادیں۔ یہ شاعر ہیں حضرت کاشف الہاشمی، نکھرا ہوا رنگ، بلند پیشانی، سنہرے چشمے کے اِحسانات سے گراں بار بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا ہوا قد، ذہانت کا پیکرِ جمیل، بیٹھیں تو کوہِ گراں کی نشست، چلیں تو ڈھال سے اُترتے ہوئے محسوس ہوں، یہی ہیں مملکتِ شعر وسخن کے خاموش تاج دار، اس فن میں

تَلَمُّذ کسی سے نہیں؛ مگر ذرّوں کو ہاتھ لگادیں تو وہ ستارے بن کر چمکنے لگیں، اُن کو ترتیب سے رکھ دیں تو کہکشاں کی تصویر ابھر آئے، مضامین اُن کے سامنے خود گرفتاری کی پیش کش کریں اور الفاظ موتیوں کی لڑی بن کر اُن کے قلم سے بکھرنے میں فخر سمجھیں۔'' (پیش لفظ ''واردات'' از مولانا عبدالجلیل راغبیؔ، ص ۸)

مولاناؒ کو نثر ہی کی طرح نظم میں بھی زبردست قدرت تھی، وہ نہ صرف خوش گو شاعر تھے؛ بل کہ اُن کی شاعری میں استادانہ پختگی اور اَصالت تھی۔ اس فن میں اُن کے استاذ مولانا محمد عثمان کاشفؔ الہاشمی (۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء = ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء) تھے، جو دیوبند کے پڑوس میں واقع گاؤں ''راجو پور'' کے باسی تھے اور جن کے تفسیری سلسلے ''ہدایت القرآن'' کو بڑی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ مولانا کاشفؒ صاحبِ بصیرت عالم، صاحبِ طرز نثر نگار اور صاحبِ اِدارک شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں علامہ اقبالؒ (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء = ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) کا سا رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے، اُنھی کی طرح کائنات کو اصلاً مومن کی میراث سمجھتے تھے اور خودی اور فقرِ غیور کی پرورش پر توجّہ کی مسلمانوں کو دعوت دیتے تھے۔

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری کی شاعری میں اپنے استاذ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے حمد ونعت بھی کہی ہے اور نظم وغزل بھی، قطعات ومراثی بھی اور مدحیہ قصیدے بھی۔ اُن کی شاعری میں عالمانہ وقار، استادانہ شکوہ، ماہرانہ نکتہ آفرینی، کے ساتھ ساتھ مومنانہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ غزل گوئی میں انھوں نے اصغرؔ گونڈوی (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء = ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) کا تتبع بھی کیا ہے، ایک آدھ غزل میں میر تقی میرؔ (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء = ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کا انداز بھی نظر آتا ہے، جگرؔ مرادآبادی (۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء = ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) تو ہر شعروادب کا مذاقِ لطیف رکھنے والے کے محبوب رہے ہیں، تو مولاناؒ جیسے زبان کے اداشناس کے کیوں نہ ہوتے۔

ظفرؔ بجنوری کے یہاں بہت سے ان مضامین میں بھی ندرت کا رنگ بہت شوخ ہے، جنھیں اساتذۂ سُخن نے بھی اپنے رنگ میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ مثلاً غم کو انگیز کرنا؛ بل کہ اس کو متاعِ زیست خیال کرنا کے مضمون کو بہت سے شعرا نے اپنے شعر میں نظم کیا ہے۔ غالبؔ (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء = ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء) کا شعر تو ضرب المثل ہے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اور

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شاعر دردؔ کلیم عاجزؔ پٹنویؒ (۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء = ۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء) نے غالبؔ سے بہت آگے کی بات کہہ دی ہے، جس سے عیاں ہوتا ہے کہ غم کے بغیر زندگی جینی دشوار ہے:

غم تو متاعِ زیست ہے، اُس سے گریز کیا
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

ظفرؔ بجنوری کے یہاں یہ مضمون اور خوبی و بانکپن سے اِس طرح ادا ہوا ہے کہ اس سے غم کے نہ صرف قیمتی اثاثہ ہونے کا تصور جاگزیں ہوتا ہے؛ بل کہ اس کے مقدس و پاکیزہ پونجی ہونے کا اعتقاد راسخ ہوتا ہے اور یہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسا عطاے الٰہی ہے، جس سے باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو نوازتا ہے:

متاعِ غم، عطاے خاص ہے، سجدے کے دیوانے!
یہ دولت اُس کو دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

انسان خطا کار ہے، بہت احتیاط کے باوجود، اس سے بہت سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن بہت سے خدا کے بندے بڑے رجائیت پسند ہوتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے، وہ ہمارے اور دیگر بندوں کے سارے گناہ معاف کردے گا۔ بہت سے خدا کے بندے یہ خیال کرتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم شافعِ محشر ہیں، اِس لیے ہمارے گناہ کے انباران شاء اللہ آپ ﷺ کی شفاعت سے بخش دیے جائیں گے۔ اِس مضمون کو عربی زبان میں علامہ بوصیریؒ (ابوعبداللہ شرف الدین محمد بن سعید بن حماد بن عبداللہ صنہاجی بوصیری مصری ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء =۶۹۶ھ/۱۲۹۵ء) نے قصیدۂ بردہ کے ایک شعر میں بہت البیلے اور رقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے، ہر باشعور مسلمان اس کو پڑھتے وقت بے طرح جذبات سے سرشار ہوجاتا ہے۔ شعر یہ ہے:

لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّی حِینَ یَقْسِمُهَا
تَأْتِي عَلَىٰ حَسَبِ الْعِصْیَانِ فِيْ الْقِسَمِ

(امید ہے کہ میرے پروردگار کی رحمت، جب وہ اُس کو اپنے بندوں میں تقسیم کرے گا، بہ قدر گناہ حصوں میں آئے گی) یعنی جتنے گناہ زائد ہوں گے، اُسی قدر رحمتِ الٰہی زائد ہوگی۔

فارسی کے ایک شاعر نے اِسی مضمون کو اِس طرح ادا کیا ہے، جس میں ناز و انداز کا رنگ غالب تو ہے؛ لیکن علامہ بوصیری والی رقت انگیزی اور جگر سوزی نہیں ہے:

پیشِ عفوش قلتِ تقصیرِ ماست
عفوِ بے اندازہ می خواہد گناہِ بے حساب

(اُس کے درگزر کے سامنے میرا گناہ معمولی ہے، حق تعالیٰ کی بے انتہا مغفرت ہمارے بے شمار گناہ کی متقاضی ہے)

دوسرے فارسی شاعر نے رجائیت کی حدوں کو عبور کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا ہے:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارا نند

(اے خداشناس چلو ہٹو! ہماری قسمت میں جنت ہے؛ کیوں کہ خدا کے کرم کا استحقاق گنہ گاروں کو ہے، ہم چوں کہ گنہ گار ہیں؛ اس لیے ہمیں جنت ضرور ملے گی، تمھارا کیا حال ہوگا وہ خدا ہی کو معلوم ہے)

اصغر گونڈویؒ نے اس مضمون کو اردو زبان کے خوب صورت پیرایے میں اس طرح پرویا ہے:

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

اصغر نے ''متاعِ ذوقِ عصیاں'' کی انوکھی ترکیب سے اِس شعر کو غیر معمولی جاذبیت عطا کی ہے؛ لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ در آئی ہے کہ ''بے تابی'' کی نسبت خدائے بے نیاز کی طرف ہوگئی ہے، بے تابی اضطرار کا نتیجہ ہوتی ہے، جس سے خدائے ذوالجلال مُنَزَّہ ہے۔

مولانا ریاست علی ظفر بجنوری نے اِس مضمون کو اِس خوبی سے ادا کیا ہے کہ اس میں اسلامی عقیدے کے اعتبار سے کوئی نقص ہے نہ زبان و بیان کی سلاست و نزاکت کے لحاظ سے:

کرم کے ساتھ لامحدود رکھیں لغزشیں ہم نے
بہ قدرِ ظرف کیا رکھتے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

شاعرِ باشعور نے یہاں ''لغزشیں'' کا لفظ بہت برمحل استعمال کیا ہے؛ کیوں کہ ''لغزش'' اُس خطا کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جاتی ہے یا بے شعوری میں انسان سے سرزد ہوا کرتی ہے۔ گویا شاعر نے اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے امید کے ساتھ اور خدا کی رحمت و مغفرت کے یقین کے باوجود بالقصد گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے اور اللہ کی رحمت کے بھروسے ڈھٹائی اور اصرار کے ساتھ

معاصی کے بالارادہ ارتکاب سے احتراز کا درس بھی دیا ہے۔

بہ ہر کیف یہ شان دار مضمون ہے جسے مسلمان شعرا نے ہر زبان میں نظم کیا ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قُدِّس سِرُّہ العزیز (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء = ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) نے اپنے نعتیہ اردو قصیدے میں کثرتِ گناہ کے باوجود مغفرت سے بہرہ وری کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ثمرہ باور کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ سُن کے آپؐ شفیعِ گناہ گاراں ہیں
کیے ہیں میں نے اِکھٹّے گناہ کے انبار

ظفؔر بجنوری کے کلام میں ایک ندرت یہ بھی ہے کہ شعر کی کوئی بھی صنف ہو، رنگ تغزّل کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ترانۂ دارالعلوم میں بھی (جو اُن کی شاعرانہ فن کاری، بلند آہنگی اور الہامِ شعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور جس میں اُنھوں نے دارالعلوم کی تاسیس کے پس منظر، تاریخ، کارناموں کے تذکرے ساتھ ساتھ اُن اشخاص کے ناموں کی تلمیحات کو سبک روی کے ساتھ استعمال کیا ہے، جو دارالعلوم کے تاریخی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں) تغزل کا رنگ خاصا شوخ اور نکھرا ہوا ہے، مثلاً یہ اشعار پڑھیے:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، مَے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی رُوداد یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اِس وادی کا سارا دامن سیراب ہے، جوئے یثرب سے
کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اِس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں
مہتاب یہاں کے ذرّوں کو، ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے
یہ صحنِ چمن ہے برکھا رُت، ہر موسم ہے برسات یہاں
گل بانگِ سحر بن جاتی ہے، ساون کی اندھیری رات یہاں
اسلام کے اِس مرکز سے ہوئی، تقدیس عیاں آزادی کی
اِس بامِ حرم سے گونجی ہے، سو بار اذاں آزادی کی

جو شمعِ یقیں روشن ہے یہاں، وہ شمعِ حرم کا پرتو ہے
اس بزمِ ولیُّ اللہی میں، تنویرِ نبوت کی ضَو ہے
یہ مجلسِ مَے وہ مجلس ہے، خود فطرت جس کی قاسم ہے
اِس بزم کا ساقی کیا کہیے، جو صبحِ ازل سے قائم ہے
رومیؔ کی غزل، رازیؔ کی نظر، غزالیؔ کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انورؔ سے، پیمانۂ فخرالدینؔ یہاں
اِس بزمِ جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک
سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو
جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کے لیے اِعجاز ہیں ہم

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کے کلام کا مجموعہ ''نغمۂ سحر'' کے نام سے پہلی بار ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے شروع میں، اُن کے برادر نسبتی مولانا لقمان الحق فاروقی مرحوم کا مفصل مبصرانہ، ادیبانہ اور محققانہ مقدمہ ہے، جس میں شرح وبسط کے ساتھ، اُن کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اُن کے شعر کی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی ان کا مختصر سوانحی خاکہ بھی نذر قارئین کیا گیا ہے۔ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء کے ایڈیشن میں اُن کے دوسرے برادر نسبتی مولانا برہان الحق صاحب فاروقی زید مجدہ کے قلم سے ضمیمۂ احوال کا اِضافہ ہے، جس میں اُن کا مزید احوال درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا ظفرؔ بجنوریؒ نے اپنے قلم اِعجاز رقم سے اپنے شفیق ومربی بھائی اور شعروسخن کے باب میں اپنے استاذ مولانا محمد عثمان متخلص بہ ''کاشفؔ'' کی ''حضرت کاشف الہاشمی'' کے عنوان سے سوانح لکھی ہے، جس میں اُن کے ضروری حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اُن کے شعری محاسن، تخیلات کی بلندی اور قلندرانہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو چشم کشا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی اور جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری گدڑیوں میں کیسے کیسے لعل چھپے رہے ہیں، جن کی ہماری کم نگاہی کی وجہ سے وقت رہتے ہوئے قدر نہ کی جاسکی اور وقت کے بعد سوائے حسرت ویاس کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس کے بعد دیوان کی ابتدا دعا سے کی گئی ہے، اس کے بعد تین نعتیں درج ہوئی ہیں، پھر ''عازم بیت اللہ کے نام'' کے عنوان سے ایک نظم پیش کی گئی ہے جو قدرے طویل ہے، پھر حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہ کی نعتِ فارسی کا اردو ترجمہ شعر میں صاحبِ دیوان نے پیش کیا ہے، پھر غزلوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جو ص ۵۵ سے شروع ہوکر ص ۱۰۰ پر ختم ہوا ہے، غزلوں کے آخر میں ایک غزل میرؔ کے تتبع میں اور چار غزلیں اصغرؔ کے تتبع میں کہی گئی، شائع کی گئی ہیں۔ ص ۱۰۱ سے نظموں اور مراثی وقطعات کا سلسلہ ہے جو ترانۂ دارالعلوم ص ۱۰۲ سے شروع ہوکر، ص ۱۳۳ پر شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء =۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کے مرثیے پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد مسک الختام کے طور پر کاشفؔ الہاشمی صاحب کی بعض نظمیں شائع کی گئی ہیں، جن میں ''فرشتہ اور انسان'' اور ''رنگا رنگ: زندگی کی مختلف تعبیریں'' اور ''حسن وعشق'' شامل ہیں۔

غالب نے کہا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس وقت ہر کس وناکس شاعری کرنے، یعنی اس کی آبرو کو پامال کرنے لگا ہے؛ اِس لیے حضرت ظفرؔ بجنوری کے دیوان ''نغمۂ سحر'' اور اُن کے عظیم استاذ کاشفؔ الہاشمی کے دیوان ''کلیاتِ کاشف'' (جو ظفر بجنوری کی نگرانی میں مولانا اشتیاق احمد قاسمیؔ دربھنگوی استاذ دارالعلوم دیوبند نے حواشی سے مزین کرکے ترتیب دے کر ابھی حال ہی میں، یعنی ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے) کا مطالعہ زبان وبیان کا مذاق رکھنے والے، ہر انسان کو کرتے رہنا چاہیے؛ تاکہ وہ نسلِ نو کو یہ بتا سکے کہ

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولاناؒ کا ایک نمایاں وصف اُن کی سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی تھا۔ وہ تقریباً ۲۲-۲۳ برس تک ہمارے پڑوسی رہے۔ افریقی منزل قدیم نزد چھتہ مسجد میں وہ زیریں منزل کے مکین تھے اور راقم بالائی منزل کا، وہ اکثر راقم کے متعلق مجلسوں میں مزاحاً فرماتے کہ ''مولانا نور عالم میرے سرپرست ہیں، یعنی میرے سر پر رہتے ہیں، میں اِن کی سرپرستی میں رہتا ہوں، خواہ یہ سرپرستی قبول کریں یا نہ کریں۔''

راقم دیکھتا تھا کہ اُن کے یہاں روزانہ خواہ ناشتے میں، خواہ دوپہر یا رات کے کھانے میں ایک

دو یا چند مہمان ضرور ہوتے تھے، عصر بعد کی مجلس میں دس بیس آدمی یا اس سے زائد بندے آشریک ہوتے اور وہ ہر ایک کو چائے اور کبھی اُس کے ساتھ وائے ضرور پیش فرماتے۔ رمضان کے دنوں میں یہ سلسلہ اور بڑھ جاتا تھا، مولاناؒ کے یہاں سے ہم سارے پڑوسیوں کے یہاں انواع واقسام کی افطاریوں سے سجا ہوا خوانِ یغما مہینے میں کئی بار ضرور آتا۔ ۲۰-۲۲ برس کی مُجاوَرَت کے بعد جب وہ اپنے نئے تعمیر شدہ مکان واقع محلّہ خانقاہ منتقل ہوگئے، تب بھی کئی سال تک اُنھوں نے اِس سلسلے کو باقی رکھا۔ پھر ہم ہی لوگوں کے دباؤ میں کہ اب جائے وقوع کی قدرے دوری ہوگئی ہے اور جو بچے ماکولاتی ہدیوں کی ترسیل کا کام کرتے تھے وہ بڑے ہوکر اب بہت مشغول ہوگئے ہیں؛ اِس لیے اب یہ سلسلہ موقوف کردیا جائے تو ہم لوگوں کو بے حد خوشی ہوگی، مولاناؒ بہ مشکل تمام اس کو موقوف کرنے پر راضی ہوے؛ لیکن اُنھوں نے ہم پڑوسیوں کو اور ہم پڑوسیوں نے اُنھیں ہمیشہ رشتہ دار اور عزیز ہی باور کیا اور خوشی وغم میں ہم ایک دوسرے کے برابر شریک رہے۔ مولاناؒ کے یہاں یا ہمارے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ضرور مدعو کرتے؛ لیکن مولانا اور اُن کی اہلیہ (صفیہ شاہانہ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء =۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء) کی طرف سے ہمارے ساتھ جو دوکرم کا معاملہ ہم سے سوا ہوتا۔

مولاناؒ مفلوک الحال کی مدد کرتے اور دردمندوں کا درد بانٹتے تھے، کسی کو کسی بات پر سرزنش کرتے تو بڑے پیار سے اِس انداز میں کرتے کہ کبھی مخاطب کو بُرا نہ لگتا۔ وہ کسی کو سخت بات بھی کہتے تو استعارہ اور رمزیت کا ایسا خوب صورت پیرایۂ بیان اور دل کش گفتگو کا ایسا انداز اختیار کرتے کہ بات کی تلخی نہ صرف کافور ہوجاتی؛ بل کہ وہ قَندِ مُکرَّر بن جاتی۔

وہ اسلاف اور اکابر کے مسلک ومشرب کی سختی سے پیروی کرتے، اس سے ذرہ برابر انحراف کو ناروا تصور کرتے۔ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے۔ اُن کی کبھی کوئی نماز قضا ہوئی نہ روزہ۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کا خاص اہتمام فرماتے۔ مسائل کے باب میں جمہور علماے احناف کی رائے اور فتویٰ پر عمل کرتے، بہت سے علما کی طرح اس سلسلے میں وہ کسی تفرد کے قائل نہ تھے۔ بالعموم مشورے کی پابندی کرتے، پھر جو رائے قائم کرتے اُس پر کوہِ گراں کی طرح جمے رہتے۔ اُن کی زندگی میں تذبذب اور انتشار کا کوئی گزر نہ تھا۔ اعتدال، تواضع، سادگی، اتّباعِ سنت، یک رنگی، فکری پختگی، یقینِ محکم؛ معرکۂ حیات میں اُن کی کارگر شمشیریں تھیں۔

مولاناؒ علمی لیاقت کے بہ قدر متنوع مشاغلِ زندگانی کی وجہ سے، تصنیف وتالیف کی طرف کما حَقُّہٗ توجُّہ نہ دے سکے؛ ورنہ وہ ایک بڑے مُؤلّف اور اہلِ قلم ہوتے؛ لیکن جو تالیفی وتحریری کام اُنھوں

نے کیے وہ بہت گراں مایہ ہیں، جن میں سرِ فہرست اُن کی صحیح بخاری کی شرح ''ایضاح البخاری'' ہے، جس کی اب تک دس جلدیں آچکی ہیں۔ اِس کتاب میں اصلاً تو اُنھوں نے اپنے جلیل القدر استاذ ودارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد قُدِّسَ سِرُّہٗ (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء =۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) کے اِفادات کو جمع کیا ہے، جنھیں اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں پابندی سے نوٹ کیا تھا؛ لیکن اُنھوں نے بخاری کی اِس شرح کو مفید تر اور دیگر شرحوں سے ممتاز تر بنانے کے لیے خود بھی سابقہ شرحوں اور علماے دیوبند کے افادات کا مطالعہ کرنے کا التزام کیا، اِسی لیے کام خاص تحقیقی اور دراز نفس ہوگیا، اس کی وجہ سے اُن کے مشغول اوقات کا بڑا سرمایہ اس میں صرف ہوگیا۔ اُن کا مزاج بہت سے اہلِ علم ونظر کی طرح یہ تھا کہ کوئی کام یا تو کیا نہ جائے اور اگر کیا جائے تو ایسا ہو کہ وہ ہر اعتبار سے بہتر سے بہتر ہو کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور یہ کہیں کہ کام اِسے کہتے ہیں؛ اِسی لیے وہ اپنے فکر ونظر کا بہت بڑا اثاثہ خرچ کرکے کتاب کی صرف پانچ جلدیں ہی تیار اور شائع کرسکے، اس دوران بڑھاپا اور اُس کے بڑھتے ہوئے عوارض اور طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے وہ بہت ٹوٹ چکے تھے اور اُن کو اندازہ تھا کہ اب یہ کام اُن سے موجودہ ضعفِ جسمانی اور فکری ناتوانی کے ساتھ اُن کے قائم کردہ معیار پر نہیں ہوسکتا تو اُنھوں نے چند سال قبل ہی اِس سلسلے میں اپنے ذی استعداد تلمیذ رشید مولانا فہیم الدین بجنوری قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند کو اس کام میں اپنا معاون بنالیا اور اُنھیں منہجِ کار بتا کر اپنی بہ راہ راست نگرانی میں اِس کام کو جاری رکھا؛ چناں چہ اُن کی حیات ہی میں اس کتاب کی دسویں جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر بازار میں آچکی تھی۔ ان شاء اللہ اُن کے بعد بھی یہ کام حسبِ سابق اُن کے نقشۂ راہ کے مطابق جاری رہے گا اور کتاب تقریباً ۲۲ جلدوں میں اِن شاء اللہ مکمل ہوجائے گی۔

اِس کتاب کی خصوصیت- جو اس کو بخاری شریف کی ساری شرحوں سے ممتاز کرتی ہے- یہ ہے کہ اِس میں اِفاداتِ اکابر کا اِحاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یعنی اگر بخاری کی حدیثوں کے حوالے سے کوئی بات اُنھوں نے کہی ہے تو اُس کو اپنی جگہ درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اِس سے استفادے میں بے انتہا آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اِمام بخاری کے تراجم کی گہرائیوں میں اتر کر اُن کی قدر وقیمت اجاگر کی گئی ہے اور اُن کی اصل حقیقت ومراد کو واضح کیا گیا ہے؛ کیوں کہ مولانا مرحوم کے استاذِ کبیر حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نَوَّرَ اللہ مرقدہ، جن کے اِفادات کو ''اِیضاح البخاری'' میں جمع کیا گیا ہے، بخاری کے تراجم کے اصل مطالب تک پہنچنے میں فرد تھے۔ بہت سے

دقیق النظر علما اُنھیں اِس حوالے سے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (احمد بن علی ابوالفضل متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) صاحب ''فتح الباری'' سے فائق قرار دیتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری (محمد بن اسماعیل جعفی ۱۹۴ھ/۸۱۰=۲۵۶ھ/۸۷۰ء) نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت ۸۰ھ/۶۹۹ء =۱۵۰ھ/۷۶۷ء) پر جتنے اعتراضات کیے ہیں، اُن کا مدلل اور بھرپور جواب دیا گیا ہے اور ایسے مواقع کی بحثوں کو سارے گوشوں کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ ان اعتراضات سے پیداشدہ الجھن کے شکار علما وطلبہ کو مکمل تشفی ہوجائے، اُنھیں کسی طرح کی تشنگی محسوس نہ ہو۔

اُن کی دوسری اہم کتاب ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' ہے، جو اُنھی کی نگرانی میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، جس کے وہ ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء سے مدیر مقرر ہوے اور کئی سال تک یہ ذمّے داری بہ حسن وخوبی انجام دی، اُن کی اِدارت اور نگرانی میں اکیڈمی سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۰۰-۱۴۰۲ھ/۱۹۸۰-۱۹۸۲ء کے دوران دارالعلوم میں جو انتشار کی حالت پیدا ہوئی، جس میں شوریٰ کی حیثیت کو کم زور کرنے کی کوشش کی گئی، اس پس منظر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی قُدِّسَ سِرُّہٗ (۱۳۱۹ھ/۱۹۱۱ء =۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء) کا ایک رسالہ ''رسالۂ اہتمام وشوریٰ'' منظرِ عام پر آیا، جس میں مہتمم کو اصل اور شوریٰ کو فرع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستورِ اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا تھا۔ حضرت مولانا چوں کہ حضرت اقدس حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نَوَّرَاللہ مرقدَہٗ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء =۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے خلیفۂ مجاز اور علم وعرفان کے حوالے سے بڑے مقام کے آدمی تھے؛ اِس لیے اُن کی طرف سے دارالعلوم کے دستورِ اساسی پر اعتراض کو علمی حلقوں میں باوزن گردانا گیا۔ اِس صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر دارالعلوم کے صدرالمدرسین حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء =۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء) نے شوریٰ کے موضوع کی تحقیق وتنقیح کے لیے مولانا ریاست علی مرحوم کو مُکلَّف فرمایا، مولاناؒ نے موضوع کے سارے مصادر ومراجع کا مطالعہ کیا اور ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' میں اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش فرمایا اور دارالعلوم کے دستور اساسی کے غیر شرعی ہونے کے شبہے کی تردید مضبوط دلائل کی روشنی میں کی۔

اِدھر چند سالوں سے وہ صحت کی ناسازی کے باوجود کئی ایک گراں مایہ علمی وتحقیقی کاموں میں لگے رہے؛ جن میں قاضی محمد اعلی تھانویؒ (متوفی بعد ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) کی کتاب ''کَشَّافُ اصطلاحات الفنون'' کی تحقیق اور اصل نسخے یعنی مصنف کے قلم سے لکھے ہوے اصل مخطوطہ مسودے سے مقابلہ

اور انتہائی تدقیق کے بعد کتاب کے صحیح اور مُحقَّق نسخے کی تیاری بھی ہے۔ اُنھوں نے اس زبردست تحقیقی کام میں اپنے کئی ایک فاضل تلامذہ سے بھی مدد لی اور اپنی زندگی ہی میں وفات سے کچھ مدت پہلے کتاب کو کمپیوٹر سے ٹائپ کرواکر مبیضے کی تصحیح وغیرہ سے فارغ ہوگئے تھے اور اب صرف اس کتاب کی اشاعت رہ گئی ہے جو ہونے کو ہے۔

خوش قسمتی سے مولاناؒ کو اِس کتاب کے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی مخطوطے کا عکس، مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری سے مل گیا، نیز کتاب کے قدیم ایڈیشن مطبوعہ کلکتہ (جو ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۲ء قسط وار شائع ہوا تھا اور جس کا عکس سہیل اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء =۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی ہدایت کے مطابق طبع کیا تھا جس کے نسخے بازار میں دست یاب ہیں) کا نسخہ اُنھیں بہ آسانی مل گیا، نیز عالم عربی سے طبع شدہ کتاب کا وہ ایڈیشن بھی مل گیا جو الف بائی ترتیب سے شائع ہوا ہے؛ کیوں کہ مصنفؒ کے یہاں الف بائی ترتیب نہ تھی؛ بل کہ اُنھوں نے پہلے حرف کو باب اور تیسرے حرف کو فصل قرار دے کر الفاظ اور اصطلاحات لکھے تھے، مثلاً ''ادب'' کا لفظ باب الألف فصل الباء میں تھا۔ مولاناؒ نے اِن تینوں نسخوں کو بنیاد بنا کر کتاب کا ممکنہ حد تک صحیح ترین اور مکمل نسخہ تیار کیا ہے اور کتاب کو عصرِ جدید کے مذاق کے مطابق مُدوَّن کر کے اس کو مفید تر بنا دیا ہے۔ اُنھوں نے مندرجۂ ذیل اہم کام کیے ہیں:

۱- مصنفؒ نے جن اصطلاحات کی تعریف میں فارسی زبان کا استعمال کیا ہے، اس کو کتاب کے متن میں اُسی طرح باقی رکھنے کا التزام کیا گیا ہے؛ تاکہ فارسی جاننے والے اہلِ علم بہ راہ راست استفادہ کرسکیں۔

۲- فارسی متن کے نیچے عربی ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے، اگر ترجمے میں کوئی غلطی درآئی تھی تو حتی الإمکان اُس کی تصحیح کردی گئی ہے؛ تاکہ فارسی سے ناواقف لوگ عربی ترجمے سے فائدہ اُٹھاسکیں۔

۳- اگر مصنفؒ نے کسی فارسی متن کا عربی ترجمہ نہیں کیا تھا تو اِس مُحقَّق نسخے میں فحص وتدقیق کے ساتھ عربی ترجمے کا اِضافہ کیا گیا ہے۔

۴- متن کی عبارت کو، عصرِ حاضر میں رائج رموزِ املا اور علاماتِ ترقیم کے مطابق لکھا گیا ہے؛ تاکہ موجودہ زمانے کے قاری کو کتاب سے استفادے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

۵- آیاتِ قرآنی اور احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔

۶- ضروری الفاظ کو با اعراب لکھا گیا ہے۔

۷- پوری کتاب کی عبارت کی دقتِ نظری کے ساتھ تصحیح کی گئی ہے؛ کیوں کہ اِس طرح کی خالص علمی وفنی کتاب میں ذراسی غلطی بھی، بڑی علمی گم راہی پر منتج ہوتی ہے۔

دوسرا اہم علمی وتحقیقی کارنامہ مولانا نے یہ انجام دیا کہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی (متوفی ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء) کی ''خلاصۃ التفاسیر'' کی تدوین وتحقیق کی اور اس سلسلے میں اپنے بعض ہونہار شاگردوں سے مدد لی۔ اِس تفسیر کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زبان میں سادگی اور ایجاز ہے اور اپنے نام کے مطابق واقعتاً بہت سی تفسیروں کی روح ہے۔ ترجمے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء = ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء = ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) کے تراجم سے استفادے کا اہتمام کیا ہے، ترجمے میں محاورہ اور لفظ دونوں کا خیال رکھا گیا ہے، احکام کے باب میں مشہور ومقبول روایات درج کرنے کی پابندی کی گئی ہے؛ جب کہ ترغیب وترہیب کے سلسلے میں وہ روایات لی گئی ہیں جو کسی معتبر کتاب میں وارد ہوئی تھیں اور اُن کا مضمون کسی امر ثابت اور خبر صحیح کے مخالف نہ تھا، آیاتِ قرآنی سے دقیق لطائف بھی اخذ کیے ہیں، اَصحابِ تزکیہ واِحسان کا بھی جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اسرائیلیات میں سے صرف وہ روایات لی ہیں جو انبیا کی عصمت، عقلِ صحیح، اخبار صحیحہ اور اصولِ اسلامی کے مخالف نہ تھیں، مسائلِ فقہیہ کو احناف کی قابلِ اعتماد کتابوں اور مصادر سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے، تفسیر میں بھی حنفی اصول کو ہی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء = ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء) کو بھی یہ تفسیر بہت پسند تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ تفسیر ہذا ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کی مصداق ہے۔ یہ تفسیر سب سے پہلے لکھنؤ کے مطبع انوارِ محمدی سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء کے درمیان شائع ہوئی، جو چار جلدوں پر مشتمل تھی، صفحات کی تعداد ۲۶۴۰ تھی۔ بعد میں یہ نایاب اور غیر مُتَدَاوَل ہوگئی تھی۔

مولاناؒ کو اِس کا ایک مطبوعہ بوسیدہ نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے سے ملا؛ چوں کہ وہ اس تفسیر کی مذکور الصدر خوبیوں سے واقف تھے؛ اِس لیے اُنھوں نے تدوین وتحقیق کے بعد اِس کی اِشاعتِ نو کا اِرادہ فرمایا؛ تاکہ طلبہ وعلما کو اِس مختصر اور غیر معمولی تفسیر سے استفادے کا موقع ملے اور دسیوں کتابوں کا خلاصہ اُنھیں اِسی ایک کتاب میں مل جائے۔

اِس کتاب کی تدوینِ نو اور تحقیق میں مولاناؒ نے مندرجۂ ذیل کام کیے اور کرائے ہیں:

۱- احادیثِ مرفوعہ کی تخریج صحیحین سے کی گئی ہے، اگر کوئی روایت صحیحین میں نہیں ملی تو دیگر

کتبِ سنن ومسانید کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۲-حوالے میں احادیث کے نمبروں کے علاوہ کتاب، باب اور مطبع کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

۳- اقوالِ صحابہؓ کا حوالہ کتبِ حدیث سے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتبِ حدیث میں اگر حوالہ نہیں ملا تو کتبِ تفسیر کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۴-مصنفؒ نے حوالوں کے لیے جن کتابوں کو بنیاد بنایا ہے، اُن سے بہ راہِ راست مراجعت کی گئی ہے اور عصری انداز میں حوالوں کی تجدید کردی گئی ہے۔

۵-مصنف کی عبارتوں میں ضروری جگہوں پر عناوین کا اِضافہ کیا گیا ہے۔

۶-تدوینِ نو میں عصری انداز میں رموزِ اِملا کا استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۷-صفحات کے نیچے جو حواشی اور حوالے مصنف کے ہیں، اُن کے آخر میں ''منه'' لکھ دیا گیا ہے، جب کہ محقق نے اپنے حواشی کو مطلق رہنے دیا ہے۔

سوانحی خاکہ

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری ۹/مارچ ۱۹۴۰ء (شنبہ: ۲۸/محرم ۱۳۵۹ھ) کو شہر علی گڑھ کے محلّہ ''حکیم سرائے'' میں پیدا ہوے۔ یہاں اُن کے والد ماجد جناب منشی فراست علیؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) درس وتدریس کے مشغلے کی وجہ سے مقیم تھے۔ آبائی وطن موضع ''حبیب والا'' ضلع بجنور ہے۔ حبیب والا ضلع بجنور کی قدیم آبادیوں میں سے ایک ہے، اس کی تاریخ تاسیس ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء ہے جو ''حبیب والہ'' کے لفظ سے نکلتی ہے، گویا یہ نام اُس بستی کا تاریخی نام ہے۔ یہ بستی اُن تین بستیوں میں سے ایک ہے جو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ھ= ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (خالد بن زید خزرجی متوفی ۵۲ھ/۶۷۲ء) کی ایک پشتینی اولاد حبیب اللہ (متوفی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) کو عطا کی تھیں، جن میں سے ایک ''فیض پور'' ہے جو قصبہ ''نہٹور'' کے قریب ہے، دوسری ''حبیب والا'' ہے اور تیسری ''سرائے شیخ حبیب'' ہے جو قصبہ ''چاند پور'' کے پاس ہے۔

مولانا کا سلسلۂ نسب ۳۵ ویں پشت پر سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ شجرۂ نسب اِس طرح ہے:

ریاست علی بن فراست علی بن مشرف علی بن صادق علی بن اصغر علی بن کمال علی بن

مولوی اِحسان علی بن مولوی محمد امین بن محمد وارث بن عبدالحق بن شیخ سعداللہ بن شیخ عبدالحمید بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ خان بن برخوردار بن عبدالکریم بن عبدالخالق بن عبدالرؤف بن شیخ اسعد بن ابوطاہر بن عبدالمالک بن شیخ صادق بن غازی سعداللہ بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسماعیل بن شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ بن خواجہ ابی منصور بن ابی معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن منصور بن سیدنا ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ۔

مولاناؒ کوئی چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مولاناؒ سے بڑے ایک بھائی تھے وراثت علی، متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء وہ ۱۶؍سال کی عمر میں ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کرکے کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مولاناؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ ''حبیب والا'' ہی میں حاصل کی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں پرائمری اسکول حبیب والا سے درجۂ چہارم کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اُن کے پھوپا مولانا سلطان الحق صاحبؒ (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء =۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اُنھیں دینی تعلیم میں لگانے کے لیے دیوبند لے آئے۔ مولانا سلطان الحقؒ بڑے دانا مربی اور سیاسی واجتماعی فہم وفراست کے حامل آدمی تھے، کتب خانے میں اُن کے پاس ہمہ وقت دارالعلوم کے اہم اساتذہ وملازمین کی مجلس لگی رہتی تھی، جن اساتذہ وملازمین کو اپنے کاموں سے ذرا فرصت ملتی، مولانا سلطان الحقؒ کی مدبرانہ وتجربہ کارانہ باتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اُن کے پاس ضرور پہنچ جاتے۔ مولانا سلطان الحق دارالعلوم کے باکمال فضلا میں تھے، حبیب والا ضلع بجنور ہی کے باسی تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۹ء =۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے اور بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا سلطان الحقؒ نے مولانا ریاست علیؒ کی مکمل تعلیم وتربیت کا معقول انتظام اپنی سرپرستی میں کیا، جس کی وجہ سے اُن کی طالب علمانہ زندگی کا ہر لمحہ اپنے صحیح مصرف میں صرف ہوا۔ دارالعلوم ہی میں مولانا ریاست علیؒ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور عربی کی ابتدائی کتابیں دارالعلوم کے مختلف اساتذہ سے دارالعلوم میں داخلے کے بغیر پڑھیں۔

۱۸؍شوال ۱۳۷۳ھ = ۱۵؍مئی ۱۹۵۴ء کو بہ عمر ۱۴؍سال دارالعلوم میں شرحِ جامی بحث فعل، کنزالدقائق، اصول الشاشی، قطبی اور نفحۃ العرب کی جماعت میں داخل ہوئے۔ محنت، اپنی ذہانت اور اپنے پھوپا مولانا سلطان الحقؒ کی حکیمانہ تربیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں اُنھوں نے دورۂ حدیث شریف کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ لائق ذکر ہے کہ اُس وقت دارالعلوم میں ۵۰ نمبرات آخری نمبرات ہوا کرتے تھے؛

لیکن مولاناؒ کو اُن کے اساتذۂ گرامی نے حد درجہ خوش ہوکر کسی کتاب میں ۵۵، کسی میں ۵۴، کسی میں ۵۳ اور کسی میں ۵۲ نمبر دیے، صرف ایک کتاب میں ۵۰ نمبر ملے۔ سالانہ امتحان میں ہر کتاب میں نمبروں کی تفصیل اِس طرح ہے:

بخاری شریف ۵۵، مسلم شریف ۵۲، ترمذی شریف ۵۲، ابوداؤد شریف ۵۳، نسائی شریف ۵۵، ابن ماجہ شریف ۵۲، طحاوی شریف ۵۳، مُوطّا امام مالک ۵۴، مُوطّا امام محمد ۵۳۔ گویا اُنھیں کل ۵۰۰ نمبرات کی بہ جائے ۵۲۹ نمبرات ملے جو غیر معمولی بات ہے۔

دورۂ حدیث شریف کے سال اُنھوں نے بخاری شریف حضرت مولانا سید فخرالدین احمد نَوَّرَاللہ مرقدَہٗ (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء =۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) سے پڑھی، جب کہ مسلم شریف اور ترمذی شریف حضرت علاّمہ محمد اِبراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء = ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) سے پڑھیں، ابوداؤد شریف حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء = ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) سے، نسائی شریف وابن ماجہ شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) سے، طحاوی شریف حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء =۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) سے، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) سے، مُوطّا امام مالک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء =۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) سے اور مُوطّا امام محمد حضرت مولانا محمد جلیل کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء) اور حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشترکہ طور پر پڑھی۔

طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیبِ کامل کا امتحان فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا؛ چناں چہ ''سرسید گولڈ میڈل'' سے سرفراز کیے گئے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد ہی اُنھوں نے ''اِیضاح البخاری'' کی ترتیب کا کام شروع کردیا، ذریعۂ معاش کے لیے خوش خطی سیکھی، اِس کے لیے اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ خوش خطی کے صدر مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) کے سامنے زانوئے تلمُّذ تہہ کیا۔ مولانا ریاست علیؒ جلی اور خفی دونوں طرح کی کتابت بہت نفیس کرتے تھے۔ فاؤنٹن پن سے بھی وہ تیز لکھنے کے باوجود ایسا لکھتے تھے کہ اُن کی تحریر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی تھی۔ اِس سلسلے میں بھی دارالعلوم کے اساتذہ میں امتیازی شان کے حامل تھے۔ جو لوگ اہلِ قلم، مصنف اور مضمون نگار ہوتے

ہیں، بالعموم اُن کی تحریریں خوب صورت اور جاذب نظر نہیں ہوتیں؛ لیکن کچھ لوگ مولانا ریاست علیؒ جیسے بھی ہوتے ہیں، جو بولتے ہیں تو موتیاں رولتے ہیں، لکھتے ہیں تو تحریر کے ظاہر و باطن سے قاری کو اسیرِ بے دام بنالیتے ہیں۔

تقریباً تین ساڑھے تین سال دہلی میں جمعیۃ علماے ہند میں برسرِعمل رہے۔ آدھی مدت تک الجمعیۃ پریس گلی قاسم جان دہلی کے منیجر رہے اور آدھی مدت الجمعیۃ بک ڈپو واقع جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کے منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کے بعد اُنھوں نے دیوبند میں کتابت اور دینی کتابوں کی اِشاعت کی خدمت شروع کی۔ ''کاشانۂ رحمت'' اور ''مکتبہ مجلس قاسم المعارف'' کے نام سے اشاعتی اِدارے قائم کیے، جن سے دیوبند میں پہلی مرتبہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء =۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) کی ''تاریخِ اسلام'' اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری (متوفی ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) کی ''رحمۃ للعالمین'' شائع کی۔ وہ اس زمانے میں لال مسجد دیوبند کے قریب ایک کرایے کے مکان میں رہتے تھے، اسی دور میں راقم کی اُن سے پہلی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں، اُن کے ایک قابلِ رشک ہم درس مولانا محمد اُویس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ساڑھے نو بجے صبح جمعہ: ۳؍جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ= ۲۵؍ستمبر ۱۹۹۸ء) کے برادرِ خُرد مولوی عمیس اختر قاسمی کی معیت میں ہوئی، جو اُن کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مولانا کی خوش اخلاقی اور شیریں کلامی سے بہت محظوظ ہوا۔ اُنھوں نے اِس موقع سے یہ نصیحت بھی کی کہ عزیزم اگر محنت اور لگن سے پڑھنے کا ارادہ ہے تو شہر کے طلبہ سے راہ ورسم نہ بڑھانا؛ ورنہ دارالعلوم کی علمی فضا سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھاسکوگے۔ مولانا ریاست علیؒ اپنے رفیق درس مولانا اویس القاسمی سے دلی تعلق رکھتے تھے؛ بل کہ بعض حیثیتوں سے اُنھیں اپنے سے فائق سمجھتے تھے اور اُن کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے موقع سے وہ خود زیریں منزل افریقی منزل قدیم سے، جہاں اُس وقت اُن کی رہائش تھی، راقم کے پاس بالائی منزل پر تشریف لائے جہاں ہماری اب بھی رہائش ہے اور تعزیت فرمائی کہ وہ میرے پیارے دوست تھے اور بہت سی باتوں میں مجھ سے برتر تھے، چوں کہ وہ تمھارے بھائی ہوتے تھے کہ اُن کے پردادا اور تمھارے پردادا سگے بھائی تھے، اِس لیے میں تم سے دلی تعزیت کرتا ہوں، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں ہم سبھوں کو ایک دوسرے سے ملائے۔

اِن ساری مصروفیات کے ساتھ خواہش مند طلبہ کو تطوُّعاً کتابیں پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ

مدرسہ اصغریہ دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں وہ شاعری بھی کرتے تھے، بہت سے اشعار دوسروں کو لکھ کر دے دیے، کلام کا بہت مُنتَخَب حصہ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں ''نغمۂ سحر'' کے نام سے شائع ہوا۔

۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں مولانا سلطان الحقؒ کی صاحب زادی ''صفیہ شاہانہ'' سے اُن کا عقد نکاح ہوا، جن کے بطن سے اُن کے تین صاحب زادے مولانا سفیان قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان قاسمی اور مولانا محمد سعدان قاسمی ہیں۔ الحمدللہ ساری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہے اور علمی وعملی دنیا میں سرگرم کار ہے۔

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ ابتدائی میں تقرر ہوا، ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں وسطی ب میں ترقی دی گئی، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں وسطی الف میں ترقی دی گئی۔ اِن ترقیات کے لیے اُنھوں نے کوئی درخواست نہیں دی؛ بل کہ مجلس شوریٰ نے ازخود لیاقت کی بنیاد پر اُنھیں ترقیات سے نوازا۔

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں رسالہ ''دارالعلوم'' کا مدیر مسئول مقرر کیا گیا، اُنھوں نے مختلف تدریسی وغیر تدریسی ذمے داریوں کے ساتھ دوسال تک یہ اہم خدمت بہ حسن وخوبی انجام دی۔

۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں اُنھیں درجۂ وسطیٰ الف سے درجۂ علیا میں ترقی ملی۔ مولاناؒ میں جو طبعی انکساری تھی اور شہرت ونام وری سے احتراز کی جو خو تھی، اس کی وجہ سے اُنھوں نے درجۂ علیا میں ترقی سے معذرت کی کہ بندہ اِس کا اہل نہیں ہے؛ لیکن مجلسِ شوریٰ اُن کی اہلیت اور کارکردگیوں سے بہ خوبی واقف تھی؛ اِس لیے اُس نے اُنھیں بالاتفاق درجۂ علیا میں ترقی دی۔ اسی کے ساتھ اُنھیں نائب مجلس تعلیمی مقرر کیا گیا۔

۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء میں ناظمِ مجلس تعلیمی مقرر ہوے، اس وقت اُنھوں نے محسوس کیا کہ نظامتِ مجلس تعلیمی کی ذمے داری کے ساتھ رسالہ ''دارالعلوم'' کی ذمے داری کو کما حقہ انجام دینا مشکل ہے، تو اُنھوں نے ثانی الذکر خدمت سے سبک دوشی حاصل کرلی۔

یہ زمانہ دارالعلوم میں ہنگامی حالات کا زمانہ تھا؛ لیکن مولاناؒ کی اپنی انتظامی صلاحیت اور قدرتی فہم وفراست کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اُن کا دورِ نظامت بہ خیر وخوبی گزرا؛ بل کہ اُنھوں نے صدر مدرس اور مجلس تعلیمی کے ارکان کے مشورے سے بہت سی مطلوبہ اِصلاحات کیں جن سے دفتری امور میں آسانیاں پیدا ہوئیں، امتحانِ داخلہ کو تحریری طور پر منظّم کیا، امتحانِ شش ماہی کو سالانہ کی طرح باقاعدہ تحریری اور باوقار بنایا، تمام امتحانات میں امیدواروں کے نام کی بہ جائے کوڈ نمبر ڈالنے کا سلسلہ قائم کیا۔

۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء میں اُنھیں ''شیخ الہند اکیڈمی'' کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، اُن کے دور میں بہت سی علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں اور اکیڈمی کے ماتحت منتخب طلبہ کو تصنیف وتالیف کے لیے تیار کرنے کے نظام کو باقاعدگی ملی۔

۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء میں مجلسِ شوریٰ نے اُنھیں نائب مہتمم مقرر کرنے کی تجویز منظور کی، گوکہ وہ اس سے قبل اور اس کے بعد بھی بار بار عارضی طور پر قائم مقام مہتمم اور نائب مہتمم کی ذمّے داری انجام دیتے رہے؛ لیکن اب ان کی صحت اور ہمت پہلے جیسی نہیں رہ گئی تھی؛ اِس لیے اِس منصب کی باقاعدہ ذمے داری کے تحمل سے اُنھوں نے معذرت کردی؛ حال آں کہ صدر جمعیۃ علماے ہند ورکن رکین مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید اسعد مدنی نَوَّرَاللہ مرقدَہ (۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء = ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) گھر آکر اس ذمے داری کو قبول کرلینے کے لیے اُن کو تیار کرنے کی کوشش کی؛ لیکن مولاناؒ شدت کے ساتھ اپنی معذرت پر قائم رہے۔ چند سال بعد مجلس تعلیمی اور اکیڈمی کی ذمے داریوں سے بھی سبک دوشی اختیار کرلی اور صرف ''اِیضاح البخاری'' کے کاموں کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا۔

اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں اوّل عربی سے دورۂ حدیث شریف تک کی تمام کتابیں پڑھائیں؛ چناں چہ تقرر والے سالِ تعلیمی ۹۲-۱۳۹۱ھ/۷۲-۱۹۷۱ء میں علم الصرف، نحومیر، شرح مائۃ عامل، اِنشاے عربی، روضۃ الادب، نفحۃ العرب اور مشکاۃ الآثار پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۳-۱۳۹۲ھ/۷۳-۱۹۷۲ء میں مختارات، شرح وقایہ، ہدایۃ النحو، کافیہ، صف ابتدائی (برائے تدریس عربی زبان) اور صفِّ ثانوی، کے اسباق اُن سے متعلق رہے۔ سال تعلیمی ۹۴-۱۳۹۳ھ/ ۷۴-۱۹۷۳ء میں مختارات، مقامات حریری، نورالانوار، ملاحسن، تمرین عربی اور الفیۃ الحدیث وغیرہ کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۵-۱۳۹۴ھ/ ۷۵-۱۹۷۴ء میں بھی مذکورالصدر کتابیں ہی زیرتدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۹۶-۱۳۹۵ھ/ ۷۶-۱۹۷۵ء میں البلاغۃ الواضحہ، ہدایہ ثانی، الاشباہ والنظائر، حسامی، تمرین النحو اور کتاب النحو، آپ سے متعلق رہیں۔ سال تعلیمی ۹۷-۱۳۹۶ھ/ ۷۶-۱۹۷۶ء میں النحو الواضح، البلاغۃ الواضحہ اور ہدایہ ثانی نیز دیگر مذکورہ بالا کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سال تعلیمی ۹۸-۱۳۹۷ھ/ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ملاحسن، حسامی، اُصول الشاشی، نورالانوار، ہدایہ اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق آپ نے پڑھائے۔ سال تعلیمی ۹۹-۱۳۹۸ھ/ ۷۸-۱۹۷۷ء میں تفسیر ابن کثیر (سورۂ بقرہ وآل عمران) البلاغۃ الواضحۃ، ہدایہ ثانی اور دیوان متنبّی، آپ کے زیرتدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۱۴۰۰-۱۳۹۹ھ/ ۷۹-۱۹۷۸ء میں تفسیر ابن کثیر، شرحِ

عقائد، ہدایہ ثانی اور البلاغۃ الواضحہ آپ سے متعلق رہیں۔ سال تعلیمی ۱۴۰۱-۱۴۰۰ھ/ ۸۰-۱۹۷۹ء میں مشکاۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق آپ کے ذمّے رہے۔ سال تعلیمی ۱۴۰۲-۱۴۰۱ھ/ ۸۱-۱۹۸۰ء میں مشکاۃ، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوانِ حماسہ، ابن ماجہ شریف اور ہدایہ ثانی، آپ سے متعلق رہیں۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۳-۱۴۰۲ھ/ ۸۲-۱۹۸۱ء اور ۱۴۰۴-۱۴۰۳ھ/ ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۱۴۰۵-۱۴۰۴ھ/ ۸۴-۱۹۸۳ء میں مشکاۃ شریف مع نخبہ، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف پڑھائیں؛ البتہ آخر الذکر سال میں حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس بھی آپ سے متعلق رہی۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۶-۱۴۰۵ھ/ ۸۵-۱۹۸۴ء اور ۱۴۰۷-۱۴۰۶ھ/ ۸۶-۱۹۸۵ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف ہی کے اسباق آپ کے ذمے رہے۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۸-۱۴۰۷ھ/ ۸۷-۱۹۸۶ء تا ۱۴۳۰-۱۴۲۹ھ/ ۸۸-۱۹۸۷ تا ۲۰۰۸-۲۰۰۸ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف کے اسباق آپ سے متعلق رہے؛ البتہ دو تعلیمی سالوں: ۱۴۱۳-۱۴۱۲ھ/ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۱۴۱۴-۱۴۱۳ھ/ ۹۳-۱۹۹۲ء میں دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق بھی آپ کے ذمّے رہے؛ جب کہ سال ہائے تعلیمی ۱۴۱۵-۱۴۱۴ھ/ ۹۴-۱۹۹۳ء و ۱۴۱۶-۱۴۱۵ھ/ ۹۵-۱۹۹۴ء میں دونوں دیوانوں کی جگہ "**مواقف المسترشدین**" آپ سے متعلق رہی۔

زندگی کے آخری آٹھ نو سالوں یعنی ۱۴۳۰ھ تا ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۰۹-۲۰۱۷ء ترمذی شریف اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق ہی آپ نے اپنے ذمے رکھے؛ کیوں کہ آپ نے تحریری مشاغل کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا تھا اور ضعف عمری بھی اسباق کے زیادہ بار سے سبک دوش ہوجانے کا متقاضی ہوئی۔

❁ ❁ ❁